Mufti shb_convert

مفتی صدرالدین خان آزردہؔ دہلوی

از۔ سید تالیف حیدرؔ

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جن عظیم علمائے کرام سے دلّی سجی ہوئی تھی اور پورے ہندوستان میں جن خانوادوں کے علم کا ڈنکا بج رہا تھا انھیں میں جناب لطف اللہ کشمیری کے خانوادے کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ لطف اللہ کشمیری کے جدِ اعلیٰ خواجہ بہاءالدین خوارزمی فاروقی مغل دورِ حکومت کے عہدِ اکبری میں دہلی آئے اور یہیں بس گئے۔ صاحبِ کشف و کرامت جناب خیر الدین ابو لخیر رحمۃ اللہ علیہ بھی انھیں کی اولاد میں سے تھے جن کے علموم و معارف کے قدرداں تمام معاصر ارباب فضل و کمال تھے۔ یہ شریعت و طریقت کے عارف و عامل تھے اور فقہائے شہر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولفینِ فتاویٰ عالمگیری میں ان کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اس خانوادے میں بعد کے عہد میں بھی اتنے ذی علم حضرات گذرے ہیں جن کی تفصیل تحریر کی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ شیخ الاسلام مولانا فخر الدین جیسی عظیم ہستی بھی اسی خاندان میں پیدا ہوئی اور انھیں کے بھائی جناب لطف اللہ کشمیری کے گھر مفتی صدرالدین آزردہؔ جیسا ماہرِ منقول و معقول پیدا ہوا۔

مفتی صاحب کی پیدائش ۱۲۰۴ھ بمطابق ۱۷۸۹ء کو دہلی میں ہوئی۔ مفتی صدرالدین آزردہؔ کا شمار اپنے عہد کے بڑے عالموں اور فاضلوں میں ہوتا ہے۔ آپ کو بیک وقت کئی علوم میں دسترس حاصل تھی۔ صرف و نحو، منطق و فلسفہ، معانی و بیان، ادب و انشا، فقہ و حدیث اور تفسیر و اصول وغیرہ میں آپ یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد جناب لطف اللہ کشمیری سے حاصل کی اور علمِ منقولات کے لئے خالو ادۂ ولی اللہی کی طرف رجوع کیا۔ حضرت شاہ عبد العزیز ، حضرت شاہ عبد القادر اور حضرت شاہ رفیع الدین آپ کے علوم نقلیہ کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں اور معقولات کا درس آپ نے اپنے استاذِ مطلق علامہ فضلِ حق خیر آبادی کے والدِ بزگوار علامہ فضلِ امام خیر آبادی سے لیا۔ شاہ عبد العزیز صاحب اور

فضلِ امام خیر آبادی کے گھرانے اس دور میں دو بڑی درس گاہیں تسلیم کی جاتی تھیں اور دہلی و اَطراف ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے طلبہ یہاں آکر ان سے شرفِ تلمذ حاصل کرتے تھے۔ ان دونوں خانوادوں میں علوم عقلیہ اور نقلیہ کے جداجدا رنگوں کے باوجود دونوں گھرانوں کو دونوں علوم میں مہارتِ تامّہ حاصل تھی۔ اسی سے متعلق ایک واقعہ ہے کہ:

''جس زمانے میں مفتی صاحب اور علامہ، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ و اصول اور کلام و تفسیر کا درس لے رہے تھے انھیں دنوں ایک روز علامہ اور مفتی صاحب یہ باتیں کرتے ہوئے درس گاہ کی طرف جارہے تھے کہ اس خاندان کے لوگ علومِ دینیہ حدیث و فقہ، تفسیر وغیرہ خوب جانتے ہیں مگر معقولات نہیں جانتے

یہ دونوں شاہ صاحب تک پہنچے بھی نہ تھے کہ شاہ صاحب نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ ایک بوریا مسجد سے باہر صحن میں ڈال دو اور ایک مسجد کے اندر بچھادو اور جب فضلِ حق اور صدرالدین آئیں تو ان کو وہیں صحن میں بٹھادینا۔ ان کے آنے پر شاہ صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ میاں آج سبق پڑھانے کو جی نہیں چاہتا البتہ یہ جی چاہتا ہے کہ کچھ معقولی گفتگو ہو۔ یہ دونوں اس میدان کے مرد تھے ہی فوراً بولے '' جیسی حضرت کی خوشی۔''

شاہ صاحب نے کہا کہ کوئی مسئلہ لو قوی پہلو تم اختیار کرو کمزور مجھے دو۔ چنانچہ ''حصول الاشیاء بانفسھا و باشباحھا'' پر گفتگو شروع ہوئی۔ شاہ صاحب نے دلائل سے ''باشباحھا'' کے قول کو ثابت کر دکھایا۔ بالآخر دونوں کو اعتراف کرنا پڑا۔ شاہ صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: تم یہ نہ سمجھو کہ ہمیں معقول نہیں آتی۔''(بحوالہ: مفتی صدرالدین خاں آزردہ ؛از؛عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی)

مفتی صاحب کا منقولاتی سلسلۂ تلمذ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے وسیلے سے ہوتا ہوا سترہ واسطوں سے محدثِ جلیل ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم البخاری تک پہنچتا ہے۔ اور معقولاتی سلسلہ مولانا فضل امام خیر آبادی کی طرف سے شیخ الرئیس بوعلی سیناتک۔

مفتی صدرالدین خاں آزردہ جس زمانے میں فضل امام خیر آبادی سے تعلیم حاصل کر رہے تھے اس عہد میں علامہ فضل امام دہلی میں صدر الصدوری کے منصب پر فائز تھے۔ یہ انگریزی عہد میں جج کا عہدہ تھا اور اس سے بڑا منصبُ علماء و

شرفاءوارباب علم میں کسی کے پاس نہ تھاجو فضل امام خیر آبادی کے بعد مفتی صدرالدین خاں آزردہؔ کو نصیب ہوا۔ اس عہدے کے متعلق 'جناب خلیل الرحمٰن اعظمی' کے بڑے بھائی 'عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی' اپنی کتاب 'مفتی صدرالدین آزردہؔ' میں رقم ترازہیں کہ:

''یہ عہدہ تنخواہ اور منصب کے لحاظ سے انگریزی دور کے جج کے برابر تھا۔ لیکن معزز ترین عہدہ شمار کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل بڑھاتو انگریزوں کو اس بات کی فکر ہوئی کہ مسلمانوں کے علماء شرفاء اِفتاء و صدارت کے مناصب قبول کریں۔ اس لیے اس دور کے اکثر اکابر وافاضل کو اس عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔''

مفتی صاحب کو اس منصب پر بٹھانے سے پہلے انگریزی ریذیڈنٹ ڈیوڈ ڈاکٹر لونی نے اکبر شاہ ثانی بادشاہ سے مشورہ بھی کیا تھااوران کی منظوری کہ بعد مفتی صاحب کو اس عہدے کے لیے چن لیا گیا۔ تقریباًاڑتیس سال کی عمر میں مفتی صاحب اپنے معقولی استاد کی مسند پر صدرالصدور بن کر بیٹھے اور تیس سال تک پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے فرض کو ادا کرتے رہے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہؔ ۱۸۲۷ء میں اس عہدے پر بیٹھے اور ۱۸۵۷ء کو منصب صدرالصدور سے مستعفی ہو گئے۔

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی اپنی مشہور کتاب ''اتحاف النبلاالمتقین باحیاءمآثر الفقہاالمحدثین''(بحوالہ: مفتی صدرالدین خاں آزردہ؛از؛عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی) میں مفتی صاحب کے اس عہدے کے متعلق صفحہ نمبر ۲۶۲ پر لکھتے ہیں کہ:

''مفتی صاحب کو انگریزی حکومت نے ۱۸۲۷ء کے قریب صدرالصدوری اور مفتی دہلی مقرر کیااور اس حیثیت سے وہ مغربی بلکہ مشرقی و شمالی دہلی میں فتوے دیتے تھے اور امتحان مدارس و صدارت حکومت دیوانی بھی ان کے سپرد تھی۔''

مفتی صاحب کو اس عہدے پر فائز کرنے کی ایک بڑی وجہہ یہ بھی تھی کہ شہر کے تمام علماء اور فضلاء ان کی حق شناسی و حق گوئی اور امانت و دیانت سے واقف تھے۔ پورے شہر میں ان کے علم کا چرچا تھا۔ ان کا شمار علامہ فضل حق خیر آبادی،

مفتی سید رحمت علی، مولانا عبد القادر رامپوری، مولوی جلال الدین ہروی اور مولانا امان علی جیسے مشاہیر علماء میں ہوتا تھا۔

مفتی صاحب صرف اسی میدان تک محدود نہیں تھے بلکہ علمائے کرام کے ساتھ مشائخ عظام اور مشاہیر شعرائے دہلی کی فہرست میں بھی انکا نام سر فہرست لیا جاتا تھا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ وہ عہد ایسا نہ تھا جہاں آج کی طرح غیر معیاری اور غیر علمی حضرات شعر کہہ رہے تھے بلکہ اس زمانے میں غالبؔ جیسا نابغۂ روزگار شاعر موجود تھا اور ایک غالبؔ ہی کیا ذوقؔ، مومنؔ، صہبائیؔ، علویؔ، ممنونؔ، نیر رخشاںؔ، آغا جان عیشؔ، نواب زین العابدین خاں عارفؔ اور غلام مصطفے خان شیفتہؔ جیسے شعرا موجود تھے جن کی داد سے بادشاہ وقت کے کلام پر معیار کی مہر ثبت ہوتی تھی، جن سے قلعہ معلی کے وارثین آداب مجلس سیکھتے تھے اور جن کا روسائے شہر اپنے اتالیق ہونے کا چرچا گھر گھر کرتے تھے۔ جب ایسے لوگ کسی کی زبان دانی اور حق گوئی کی شہادتیں دیں تو اس کے میعار کا اندازہ ہم بخوبی کر سکتے ہیں۔ مولوی کریم الدین اپنی کتاب ''تذکرہ فرائد الدہر'' میں صفحہ نمبر ۳۹۶ پر مفتی صاحب کی فرض شناسی کے متعلق کس طرح رطب اللسان ہیں ملاحظہ کیجیے۔

''یہ عہدہ اس شخص کے واسطے ہی زیبا تھا اور واقع میں ہر ایک مقدمہ کی وہ ایسی تحقیق کرتے ہیں کہ یقیناً کوئی فیصلہ ان کا خالی حق سے نہیں ہوتا۔ حق دار کو حق پہنچاتے ہیں اس لیے اب میں یہ کہتا ہوں کہ خدا تعالی تا قیام قیامت اس شخص کو اس عہدہ پر قائم رکھے۔ ظلم جہاں سے یک قلم موقوف ہو۔''

مفتی صاحب کا کردار اتنا منصفانہ تھا کہ وہ اپنے منصبِ منصفی پر بیٹھ کر سارے تعلقات بھول جاتے تھے اور قانونِ فاروقی کو نگاہ میں رکھ کر ملزم کے خلاف فیصلہ سناتے تھے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس عہد میں رواداریوں کا بھی پاس رکھا جاتا تھا۔ ''یادگار غالبؔ'' میں حالیؔ لکھتے ہیں کہ آزردہؔ کو غالبؔ کا رنگِ شعر ناپسند تھا۔ اکثر آزردہؔ کو غالبؔ کے انداز شاعری پر غصہ بھی آجاتا مگر یہ ادبی چپقلش ذاتی زندگی میں کبھی داخل نہ ہونے پائی۔ خمخانۂ جاوید میں ایک واقعہ مذکور ہے جس سے آزردہؔ اور غالبؔ کے ذاتی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔

''ایک دفعہ آپ کے دوست مرزا غالبؔ بہت مقروض ہو گئے۔ قرض خواہوں نے ان پر مقدمہ دائر کر دیا ۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیش ہوئے تو یہ شعر پڑھا:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہ سنتے ہی مفتی صاحب مسکرا دیے۔ اور اپنے پاس سے ان کے قرض کا روپیہ ادا کر دیا۔"

مفتی صاحب کی کئی باتیں اپنے استاد مولانا فضل امام خیر آبادی سے بہت ملتی ہیں۔ انھیں میں ایک ان کی تدریسی خدمات بھی ہیں۔ مفتی صاحب بھی اپنے استاد فضل امام خیر آبادی کی طرح اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے بعد طلبہ کی بڑی جماعت کو درس دیا کرتے تھے اور بہت شفقت اور محبت سے اپنے شاگردوں کو فقہ، حدیث، تفسیر، بیان، حساب، منطق اور فلسفہ وغیرہ پڑھایا کرتے تھے۔ علماے عصر و فضلاے دہر ہندوستان کے کونے کونے سے آکر اس مدرس کے تلامذہ کی فہرست میں اپنا نام درج کرواتے اور اس امر کو اپنے لیے اعزاز و افتخار کی دلیل بناتے تھے۔

آپ کا حلقہ درس بہت وسیع تھا اور آپ کے شاگردوں میں اس عہد کے سربر آوردہ افراد شامل تھے۔ پرویز اصلاحی اپنی کتاب 'مفتی صدرالدین خاں آزردہؔ' میں رقم طراز ہیں کہ:

"مفتی صاحب قابل اور ہونہار شاگردوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے ان کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ان سے برتاؤ کرتے ہمیشہ ان کی دل جوئی کرتے کثرتِ مشاغل کی بنا پر کبھی درس میں تاخیر ہو جاتی یا ناغہ ہو جاتا تو افسوس کرتے۔"

مفتی صاحب نے اپنے عہد میں کئی مدارس قائم کئے، تعلیم و تعلم کے کام کو عام کیا اور تاریخی مدرسہ، مدرسہ دار البقاء جیسے شاہی مدارس کو از سر نو تعمیر کروایا۔ اس سے مفتی صاحب کے نزدیک تعلیم کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

مفتی انتظام اللہ شہابی اپنی تصنیف "غدر کے چند علماء" میں اسی تعلق سے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مفتی صاحب محکمۂ نزول کے کام میں اتنے مشغول ہوئے کہ درس کے لیے کوئی وقت نہ نکال سکے۔ کئی دن تک درس بند رہا۔ طلبہ سخت پریشان ہوئے۔ آخر ایک منچلے شاگرد نے جرأت کر کے ایک نظم لکھی جس

کے اس شعر سے اس واقعہ کی تاریخ بر آمد ہوتی ہے۔

ہاتف بدست چپ سر بینی فشردہ گفت

بیماریِ نزول بہ صدرالصدور شُد

اس نظم کا یہ اثر ہوا کہ مفتی صاحب نے درس کا سلسلہ شروع کر دیا۔"

انھیں خدمات کو دیکھتے ہوئے مفتی صاحب کو دلی کالج کے اہم ممبران میں شامل کیا گیا۔ یہ وہی دلی کالج ہے جس سے محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ ، مولوی کریم الدین اور ماسٹر پیارے لال جیسے اصحابِ علم نے تعلیم حاصل کی۔ مفتی صاحب کے ممتاز ترین تلامذہ میں سے کچھ نام دیئے جا رہے ہیں جن میں مفتی سعد اللہ مراد آبادی، مولوی ظہور علی دہلوی، (سر سید احمد خاں)، مولانا نور الحسن کاندھلوی، نواب محمد یوسف خاں ناظم وائی رامپور، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، نواب ضیا الدین احمد خاں نیر رخشاںؔ دہلوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیر الدین صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دلی کے اس عہد کو جب تاریخ کی نظروں سے دیکھو تو اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے کیسے باکمال اس شہر میں یکجا ہو گئے تھے۔ جن کی تعریف میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولانا عبدالحی رائے بریلوی، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، سر سید احمد خاں اور مولانا خیر الدین جیسے ذی علم حضرات رطب اللسان تھے۔ کوئی ان حضرات کو آفتاب سخن پہ مجمعِ نجوم قرار دیتا۔ کوئی ان سخنورانِ باکمال کے جمگھٹے پہ یہ تبصرہ کرتا کہ "جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمیں پر رشک آتا ہو گا۔"

مولانا الطاف حسین حالیؔ "یادگار غالبؔ" کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"تیرہویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزُل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسن اتفاق سے دار الخلافہ دہلی میں چند اہلِ کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہدِ اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالبؔ مرحوم فرماتے ہیں:

ہندرا خوش نفاسانند سخنور کہ بود

یاد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومنؔ و نیرؔ و صہبائیؔ و علوی و انگاہؔ
حسرتیؔ اشرفؔ و آزردہؔ بود اعظم شاں

جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ مفتی صدر الدین خان آزردہؔ جید فاضل اور متبحر عالم تو تھے ہی ساتھ ہی تینوں زبانوں یعنی عربی، فارسی اور اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ انھوں نے اپنا کوئی دیوان ترتیب نہیں دیا البتہ ان کا لکھا ہوا ایک تذکرہ 'شعرائے اردو موجود ہے۔ ویسے تو مفتی صاحب خود بہت اعلی درجے کے شاعر تھے مگر اپنے ابتدائی زمانے میں انھوں نے شاہ نصیر اور مجرم اکبر آبادی کو اپنا کلام دکھایا تھا اور بعض مستند حوالوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ میر ممنونؔ سے بھی آزردہؔ نے مشورۂ سخن کیا تھا۔ لہٰذا ان تینوں حضرات کو مفتی صاحب کے اساتذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

مفتی صاحب کے شعر پڑھنے کے انداز کے متعلق بھی دو روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔ ایک مرزا فرحت اللہ بیگ کے حوالے سے جو انھوں نے اپنے تصنیف کردہ ڈرامے 'دلی کی آخری شمع' میں بیان کی ہے اور دوسری مفتی صاحب کے عہدِ ضعیفی کے شاگرد مولانا فقیر محمد جہلمی ثم لاہوری کی جس کی صراحت مولانا نے اپنی مشہور زمانہ کتاب 'حدائق الحنفیہ' میں کی ہے۔ چونکہ مرزا صاحب کے بیان کردہ تمام واقعات قیاسی ہیں اور اگر انھوں نے کہیں سے استفادہ بھی کیا ہے تو اس کا حوالہ نہیں دیا اس لیے مجھے مولانا فقیر صاحب کا پیش کردہ بیان ہی صحیح معلوم ہوتا ہے اور ایسے ماخذ پر اسی وقت تکیہ کیا جا سکتا ہے جب اس سے زیادہ مستند حوالہ موجود نہ ہو۔ مولانا فقیر محمد جہلمی ثم لاہوری اپنی کتاب 'حدائق الحنفیہ' میں صفحہ نمبر ۳۸۱ پر تحریر فرماتے ہیں:

" مولانا موصوف باوجود کہ چوہتّر سال کے تھے مگر ذوق شعر و سخن میں جوانان عاشق مزاج سے زیادہ مذاق رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو نہایت عمدہ کہتے تھے۔ آزردہؔ تخلص تھا بمقتضائے اس کے ہمیشہ فرط عشق اور ولولہ محبت سے آزردہ خاطر، افسردہ طبع، دیدہ گریاں، سینہ بریاں رہتے تھے اور اشعار کے پڑھنے میں نہایت دل شگاف آواز اور لحن حزیں اور صورت درد انگیز رکھتے تھے۔ جس نے آپ کی زبان سے سخن موزوں سنا ہے وہی اس کیفیت کو جانتا ہے کیا انشاو شعر تھا ایجاد سحر۔"

مفتی صاحب جتنی اچھی طرح شعر پڑھتے تھے اس سے کہیں زیادہ اچھا شعر کہتے بھی تھے۔ان کا جو کلام ہم تک پہنچا ہے وہ ان کی کل شاعری کا آدھے سے آدھا بھی نہیں ہے۔ پھر بھی ہم اس سے اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مفتی صاحب کا انداز شاعری اپنے دامن میں ایک رنگ انفرادیت لیے جلوہ بار ہے اور صرف لفظی پیرائے میں نہیں بلکہ حقیقتاً انھیں اپنے عہد کے منفرد رنگ و آہنگ کا شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔

شمس الرحمن فاروقی نے اپنی کتاب شعر، غیر شعر اور نثر میں جدلیاتی لفظ کی کار فرمائی پر بحث کرتے ہوئے آزردہؔ کے ایک شعر کا موازنہ حافظؔ اور قائمؔ سے کیا ہے اور وہ انھیں اس شعر کے آئینے میں ان دونوں سے بڑا شاعر قرار دیتے ہیں۔ سات صفحات پر پھیلی ہوئی اس بحث کا لبِ لباب مختصراً آدھے صفحے میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس سے آزردہؔ کے کلام کی اہمیت کا اندازہ ہو گا۔

فاروقی صاحب اس مباحثے میں حافظ کا شعر شامل کرنے کی وجہ پہ روشنی ڈالتے ہوئے حاشیے میں اس بات کی وضاحت فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ۔

"حافظ کا شعر نقل کر کے اپنی فارسی دانی کا مظاہرہ نہیں بلکہ صرف مجبوری کا اظہار مقصود ہے کہ اردو کے شعر نہیں مل سکے۔" میں مع اشعار اس بحث کا اقتباس یہاں پیش کر رہا ہوں تا کہ بات سمجھنے میں آسانی ہو۔

نہ سنبھلا آسماں سے عشق کا بوجھ
ہمیں ہیں جو یہ مگد دبھانتے ہیں
(قائمؔ)

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند
(حافظؔ)

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی

کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

(آزردہؔ)

’’قائم اور حافظ کے اشعار کی روشنی میں آزردہؔ کا شعر پڑھیے:

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی

کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

(آزردہؔ)

حافظ کا شعر استعاروں سے مملو ہے لیکن وہ استعارے مستعار منہ سے منسلک ہیں۔ آزردہؔ کے استعارے حافظؔ کے استعاروں کا استعارہ ہے۔ حافظؔ کا آسمان، آزردہؔ کا فرقۂ زہاد، حافظؔ کا بارِ امانت، آزردہؔ کا کمال، حافظؔ کا بارِ امانت کش، آزردہؔ کا کامل۔ حافظؔ کا منِ دیوانہ، آزردہؔ کے رند، جن کے ساتھ قدح خوار کا استعارہ مضاعف ہے۔ صرف زند کا کوئی استعارہ آزردہؔ کے یہاں نہیں ہے، یہاں اس کی کمی ہے۔ جیسا کہ میں اوپر دکھا چکا ہوں، قرعۂ فال زدن کا استعمال کر کے حافظؔ نے معنی کے چند نئے پہلو نکالے ہیں قرآن کی آیت سے بالکل الگ ہیں۔ (حافظؔ کے اس شعر کے بارے میں شبلی نے لکھا ہے کہ قرآن کی آیت کو حافظؔ سے بڑھ کر کسی اور نے نہیں بیان کیا۔) لیکن استعارہ در استعارہ ہونے کی وجہ سے آزردہؔ کا شعر ایک استعارے (اور اس کی مخفی معنویتوں) کی کمی کے باوجود اسی درجۂ شاعری کا حامل ہے جتنا حافظؔ کا۔ کیوں کے آزردہؔ کہ استعارے حافظؔ کے استعاروں کو محیط ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے معنی بھی رکھتے ہیں۔ یعنی یہ کہ رند مشرب لوگ ہی دراصل درجۂ کمال کو پہنچتے ہیں، زاہد و عابد لوگوں کے بس کا یہ روگ نہیں۔ اب یہاں ابہام بھی داخل ہو جاتا ہے، کیوں کہ فرقۂ زہاد کی ناکامی کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں (گرمیٔ عشق کا فقدان اور ظواہر پر زور، ریاکاری، دون ہمتی، معرفت کا فقدان، کیوں کہ معرفت اسی کو ملتی ہے جو پابندیٔ رسوم سے انکار کرے وغیرہ) لیکن بیان نہیں کیے گیے ہیں۔ اسی طرحِ رندان قدح خوار، صوفی صافی لوگوں کا بھی استعارہ ہیں اور مردانِ آزاد مشرب کا بھی وغیرہ۔ حافظؔ کے شعر میں ابہام ہے استعاروں کا پیدا کردہ ہے، آزردہؔ کا شعر اصلاً مبہم ہے، اس لیے شعر فہمی کے لیے زیادہ راہیں فراہم کرتا ہے۔ ان مزید توضیحات کی روشنی میں اگر یہ کہا جائے کہ آزردہؔ، حافظؔ سے چھوٹے

شاعر سہی، لیکن ان کا یہ شعر حافظ سے بڑھا ہوا ہے، تو چنداں غلط نہ ہو گا۔ بہر حال یہ بات تو پوری طرح ثابت ہو ہی چکی ہے کہ قائم کا شعر ان دونوں سے بہت نیچے ہے۔"

یہاں تو ایک شعر کا ذکر ہے اگر کوئی آزردہؔ کے دیگر اشعار کا بہ نظر غائر مطالعہ کرے گا اور فاروقی صاحب کی طرح فنی لحاظ سے اس کا موازنہ دوسرے معتبر شعرا سے کرے تو ہمیں اس بات کا علم ہو گا کہ آزردہؔ کے اشعار کیسی کیسی فنی باریکیوں سے آراستہ ہیں۔

Syed Taleef Haider

:Address

F-32, Forth floor, Street No 6

Zkir Nagar,Okhla,New Delhi

110025

:Phone

09540321387